

علامہ یوسف سیجا

ایک فکری تنقیدی زاویہ

ابو حیان سعید

1.علامہ یوسف سیجا — ایک فکری تنقیدی زاویہ

ابو حیان سعید

ابتدائیہ

علامہ یوسف سیجا کی فکر کو سمجھنے اور اس سے اختلاف کرنے سے پہلے یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ وہ مذہبی مکالمے میں سنجیدگی، شائستگی اور سوال کی گنجائش کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاہم یہی وہ مقام ہے جہاں ان کی فکر پر ایک فکری سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔

یوسف سیجا عقل کے استعمال پر جس قدر زور دیتے ہیں، بعض ناقدین کے نزدیک اس میں یہ خطرہ موجود ہے کہ عام قاری عقل کو وحی کے برابر یا کبھی کبھار اس پر حاوی سمجھنے لگے۔ اگرچہ وہ بارہا یہ واضح کرتے ہیں کہ اصل معیار قرآن ہے، مگر عملی سطح پر یہ توازن ہر سننے والے کے لیے برقرار رکھنا آسان نہیں رہتا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہر شخص میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ عقل، تعبیر اور وحی کے درمیان درست حد بندی خود قائم کر سکے؟

اسی طرح دین اور دین کی انسانی تعبیر میں فرق کو نمایاں کرنا بلاشبہ ایک اہم فکری خدمت ہے، لیکن اس کا ایک ممکنہ منفی پہلو یہ بھی ہے کہ بعض لوگ اس فرق کو بنیاد بنا کر صدیوں کی علمی روایت، فقہی ذخیرے اور اجماعی فہم کو غیر متعلق سمجھنے لگیں۔ حالانکہ یہی روایت امت کے اجتماعی شعور اور دینی تسلسل کی ضامن رہی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اصلاح اور انقطاع کے درمیان لکیر کہاں کھینچی جائے؟

یوسف سیجا کا غیر فتوٰی انداز اور اصولی گفتگو فکری افراد کے لیے تو کشش رکھتی ہے، مگر ایک عام مذہبی معاشرے میں جہاں لوگ واضح رہنمائی چاہتے ہیں، وہاں یہ اسلوب بعض اوقات ابہام بھی پیدا کر سکتا ہے۔ ہر ذہن دلیل کو خود اخذ کرنے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا، اور یہی وہ جگہ ہے جہاں علما کی رہنمائی ایک ذمہ داری بن جاتی ہے، محض ایک دعوت نہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی متوازن زبان اور شائستہ لہجہ موجودہ مذہبی سخت گیری کے مقابلے میں ایک خوشگوار تبدیلی ہے، مگر بعض ناقدین کے نزدیک یہ نرمی بعض حساس دینی معاملات میں غیر ضروری وسعت کی راہ بھی کھول سکتی ہے، جس سے دینی حدود کے بارے میں کنفیوژن پیدا ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔

ان تمام نکات کے باوجود یہ کہنا دیانت داری کے خلاف ہوگا کہ علامہ یوسف سیجا کی فکر محض رد کیے جانے کے قابل ہے۔ اصل مسئلہ ان کی نیت یا سنجیدگی نہیں، بلکہ ان کے فکری منہج کے ممکنہ اثرات ہیں، جن پر سنجیدہ مکالمہ ضروری ہے۔

لہٰذا یوسف سیجا سے اختلاف کرنا بھی فکری دیانت ہے اور ان سے سیکھنا بھی۔
لیکن اندھی عقیدت اور اندھا رد دونوں ہی علمی رویے نہیں۔

کیونکہ اگر ایمان عقل کو زندہ رکھتا ہے
تو عقل بھی روایت اور حدود کے بغیر محفوظ نہیں رہتی۔

امیرالمومنین علی بن ابی طالب کا ایک مشہور قول ھے " إِنَّ الْحَقَّ لَا يُعْرَفُ بِالرِّجَالِ، وَإِنَّمَا يُعْرَفُ الرِّجَالُ بِالْحَقِّ " یعنی بے شک حق لوگوں سے نہی پہچانا جاتا بلکہ لوگ حق کے ذریعے پہچانے جاتے ھیں ۔

علامہ یوسف سیجا میرے نزدیک اس لیے اہم ہیں کیونکہ وہ قرآن کریم کی تعلیمات پر مطلق ایمان کو ایک زندہ حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں ، دلائل سے بھرپور انکی انوکھی ترتیب و تحریر انکے وسیع مطالعے اور جدید فہم القرآن کی دلیل ھے ، وہ اس عقل و ہوش کو واپس لاتے ہیں جسے ہم نے محض جذبات میں آکر کھو دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ خود اہم نہیں ہیں، بلکہ قرآن کریم اہم ہے۔

یوسف سیجا امام مالک بن انس کا عکس ہیں۔ دونوں نے لوگوں کے سوالات کو اپنی اپنی قرآنی فہم کے مطابق عام کیا ۔

امام مالک کا منہج قرآن کریم کی اس آیات کے مطابق یہ رہا .

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا

ترجمہ: اے لوگو! بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے واضح دلیل آئی اور ہم نے تمہاری طرف روشن نور اتارا (سورة النساء،آیت 174)

امام مالک کا ایک مشہور قول ھے " **كل يُؤخذ من كلامه ويُرد** " یعنی ھر کسی کی بات سے استفادہ کیا جاسکتا ھے اور اس کی بات کو رد بھی کیا جا سکتا ھے ۔ (نفخ الطیب للمقری، جلد ۱ ص 109 المؤلف: أحمد بن محمد المقري التلمساني سنة الوفاة: 1041هـ / 1632م) .

اسی قول کے موافق علامہ یوسف سیجا بھی مفکرین کے اقوال سے استنباط بھی کرتے ھیں لیکن ساتھ انتہائ نرم انداز میں اپنی رائے بھی پیش کرتے ھیں ۔

پاکستان کے ایک نرم مزاج قرانی مفکر کا موازنہ اپنے وقت کے راسخ العقیدہ مفکر سے کرنا میرے لیے اس بحث کو آسان بنا دیتا ہے۔ دیکھیے، میں علامہ یوسف سیجا صاحب کا کوئی روایتی مداح نہیں ہوں۔ کسی مفکر سے متاثر ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ آپ خود کو ان کے حوالے کر دیں۔ امام مالک بن انس کو پڑھنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ' مالکی ' بن جائیں، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آپ اپنی رائے چھپا لیں کہ لوگ آپ کو ان کا ساتھی سمجھیں گے۔

مفکر اس طرح پیروکار نہیں بناتے جیسے سیاست دان یا جذباتی تقریریں کرنے والے بناتے ہیں۔ وہ لوگوں کا ذہن ماؤف نہیں کرتے، بلکہ وہ سکھاتے ہیں۔ وہ آپ کو سوال کرنے پر ڈانٹتے نہیں، بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ آپ سوال کریں۔ علم کی دنیا میں شخصیت پرستی نہیں ہوتی، نہ ہی وہاں پیچھے چلنے کے لیے کوئی دیوتا ہوتے ہیں، وہاں صرف اساتذہ ہوتے ہیں جن سے آپ سیکھتے ہیں۔ اس لیے 'یوسف سیجا ازم' جیسی کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ وہ انسان کو خود اپنے طریقے سے سوچنے پر چھوڑ دیتے ہیں۔

علامہ یوسف سیجا ہمارے سوالوں کا کوئی بنا بنایا یا ایک جیسا حل نہیں دیتے۔ وہ بس قران کریم کی روشنی دکھاتے ہیں، اور میں اس روشنی میں خود دیکھتا ہوں۔ اگر یہ روشنی (بطور ناقد) مجھے ان کی تردید پر اکسائے گی تو میں ایسا ہی کروں گا۔ لیکن اگر یہی روشنی (بطور مداح) مجھے ان کی تعریف پر آمادہ کرے گی تو میں وہ بھی کروں گا۔

بحث کسی ایک انسان پر نہیں ہے۔ لوگ تو صرف ایک حوالہ ہوتے ہیں، جیسے امام مالک بن انس اس سچ کا حوالہ ہے جو اس نے اپنے دورمیں بتایا تھا۔
ارسطو نے کہا تھا کہ 'افلاطون مجھے پیارا ہے، مگر سچ مجھے اس سے بھی زیادہ پیارا ہے'۔ تو اگر علامہ یوسف سیجا پیارے ہوں گے، تو سچ ہمیں ان سے بھی زیادہ پیارا ہوگا۔

آپ علامہ یوسف سیجا صاحب کو تھوڑی دیر کے لیے بھول جائیے .. اصل نکتے کو دیکھیے۔ یہ علم تک پہنچنے کے دو الگ راستوں کی بات ہے۔
ایک راستہ سوچنے کے تمام دروازے بند کر دیتا ہے اور دوسرا انہیں کھول دیتا ہے۔ ایک راستہ غصہ دلاتا ہے اور دوسرا روشنی دیتا ہے۔ ایک آپ کو بنا بنایا نتیجہ پکڑا دیتا ہے، دوسرا آپ کو بصیرت دیتا ہے۔

فرض کر لیں کہ یوسف سیجا نام کا کوئی شخص نہیں ہے لیکن قرآنی فکر پھر بھی باقی رہے گی۔ فرض کریں امام مالک نہیں تھے تب بھی یہ سوال دنیا کو بے چین رکھتا تھا کہ کائنات کیسے بنی ، اس کو کس نے بنایا ، جس نے کائنات کو بنایا وہ کون ھے اور کب سے ھے اور کیوں ھے ؟ لوگ تو عام ہوتے ہیں، خوبیاں انہیں غیر معمولی بناتی ہیں، اور یہیں سے یوسف سیجا صاحب کا کام شروع ہوتا ہے۔

ایک ایسی دنیا میں جہاں خدا کے وجود کو ایک وہم، ایمان کو ایک کہانی اور وحی کو محض ایک انسانی خواہش قرار دیا جا رہا ہے؛ وہاں وہ مذہب کو ایک زندہ حقیقت بنا کر پیش کرتے ہیں۔ (میرا مطلب یہ نہیں کہ خدا کو ثابت کرنے کے لیے کسی یوسف سیجا کی ضرورت ہے، میرا مطلب وہ فکری چیلنجز ہیں جو اج کل مذہب کو درپیش ہیں)۔ ہم ابھی تک اس پرانے دور سے باہر نہیں نکل پائے جہاں مذہب کو یا تو لالچ کے طور پر بیچا جاتا تھا یا ڈنڈے کے زور پر زبردستی منوایا جاتا تھا۔ آج کی دنیا نظریات کی دنیا ہے۔

پرانے ملحدین کے علاوہ آج کے دور کے ان مفکرین کو دیکھیے جو پوری دنیا کے لاکھوں لوگوں پر اثر انداز ہو رہے ہیں (جیسے قدما میں روسو،والٹیئر، ڈریپر ، جدید دور میں سام ہیرس، رچرڈ ڈاکنز اور دیگر)۔ وہ صرف باتیں نہیں کرتے، ان کا کام اتنا سطحی نہیں کہ اسے غصے یا جہالت میں رد کر دیا جائے۔ وہ مذہب کو ایک بڑا علمی چیلنج دے رہے ہیں اور ہم شتر مرغ کی طرح ریت میں سر نہیں چھپا سکتے۔ ہم انہیں اس لیے نہیں جانتے کیونکہ ہم نے تاریخ میں کتابیں جلا دی تھیں۔ یا اگر ہم انہیں جانتے بھی ہیں، تو ہمارا جواب یا تو جذباتی ہوتا ہے یا پھر معذرت خواہانہ۔

آج جب آپ کسی ایسے شخص کو ڈھونڈتے ہیں جو اس طرح کے چیلنج کا مقابلہ کر سکے، جو ان مفکرین کی سطح پر جا کر بات کر سکے، بلکہ ان سے آگے نکل جائے، تو مسلم دنیا میں بہت کم نام سامنے آتے ہیں اور ان میں ایک نمایاں نام علامہ یوسف سیجا کا ہے۔ ہمارے ہاں اصل مفکرین کا قحط ہے اور وہ ہماری ایک امید ہیں۔ وہ ان جذباتی تقریروں سے دور ہیں جو دلوں کو تو تڑپا دیتی ہیں مگر دماغوں کو سن کر دیتی ہیں۔ ان کا انداز بڑا باوقار اور علمی ہے۔ وہ قرآن کریم کی تعلیمات کو آج کے دور کے نوجوان کے لیے پرکشش بناتے ہی جو فرقہ واریت یا لادینیت کو ہی واحد حل سمجھنے لگا تھا۔

یوسف سیجا قرانی تعلیمات کو اس زندگی کے لیے ضروری بناتے ہیں جہاں ہم صرف عبادت ہی نہیں کرتے، بلکہ ہم لوگوں سے ملتے ہیں، لڑتے ہیں، محبت کرتے ہیں، نفرت کرتے ہیں، ٹھوکر کھاتے ہیں، گرتے ہیں، پھر کھڑے ہوتے ہیں اور گناہ بھی کرتے ہیں۔ وہ زندگی کی تمام خوبصورتیوں اور برائیوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ایک ایسے وقت میں جب مسلمانوں کو یا تو دہشت گرد دکھایا جاتا ہے یا جوکر، یوسف سیجا جیسا قرآنی ذہن مذہب کی گفتگو کو دوبارہ وقار عطا کرتا ہے۔ وہ وہی کام کر رہے ہیں جس کا علامہ اقبال نے تصور کیا تھا۔ اقبال نے ایک سوچ دی، یوسف سیجا نے اسے عمل کی شکل دی، اور اگر 'عمل' زیادہ اہم ہے، تو یوسف سیجا کی اہمیت بڑھ جاتی ھے ۔

ھم اس دور میں زندہ ھیں جہاں قرانی آیات کھل کر سامنے آرھی ھیں ۔
افسوس کی بات یہ ہے کہ اکثریت جتنا جانتی ھے اسی پر خوش ہیں اور جو نہیں جانتے اس سے ڈرتے ہیں۔ یہاں یوسف سیجا کی قرآنی سوچ ہمیں اس سچ کو چکھنے پر اکساتے ہیں جس سے ہمیں روکا گیا ہے۔ وہ علم کی پرانی بنیادوں کو گراتے نہیں بلکہ انہیں سنبھالتے ہیں۔ وہ علم اور عقل کے ڈھانچے کی اصلاح کرتے ہیں اور اسے دوبارہ تعمیر کرتے ہیں۔ وہ ہمیں 'مذہب' اور مذہبی تعبیر کے درمیان باریک فرق سمجھاتے ہیں اور یہی وہ جگہ ہے جہاں ہم انہیں سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ ہم مذہب کو مذہبی سوچ کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ ایک خدا کی طرف سے ہے، دوسری انسان کی طرف سے۔ ہم ایمان کو کلچر، معاشرے اور روایات کے ساتھ گڈ مڈ کر دیتے ہیں اور یہی چیز ہمیں سچ دیکھنے سے اندھا کر دیتی ہے۔

یوسف سیجا صاحب خدا کے احکامات، قانونی ضابطوں، معاشرتی طریقوں اور کلچر کو ان کے اصل پس منظر میں واضح کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ کیا چیز لازمی ہے، کیا مستحب ہے، کیا جائز ہے اور کس پر سزا ملنی چاہیے۔ ایک متجسس ذہن یہی کام کرتا ہے۔ وہ عام زندگی کے تقاضوں کو زہد و تقویٰ کے بلند ترین معیاروں سے الگ کر کے دکھاتے ہیں۔ ہم ہر وقت جنت دوزخ، اسلامی غیر اسلامی، خدا شیطان کی بحث میں الجھے رہتے ہیں۔ ہم جذبات میں آکر چیزوں میں فرق کرنے کی صلاحیت کھو دیتے ہیں اور وہ اسی صلاحیت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یوسف سیجا کے اصل مخاطب نوجوان هیں وہ اسلام کو پوری دنیا کے لیے نا گزیر بتاتے ہیں۔ وہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرتے، بلکہ

اسے ویسا ہی پیش کرتے ہیں جیسا کہ وہ اپنی روح، اخلاق اور تاریخ کے ساتھ موجود ہے۔ وہ کوئی اپنا نیا 'دینِ الٰہی' پیش نہیں کر رہے ، وہ اپنی ہر بات کی دلیل اسی کتاب سے دیتے ہیں جسے ہم سب مقدس مانتے ہیں۔ ان کا ایمان ان لوگوں سے کہیں زیادہ مضبوط ہے جو مذہب کو صرف اپنی پارسائی دکھانے کے لیے ایک بیج کی طرح لگائے پھرتے ہیں۔ حیرت ہے کہ اختلاف کہاں ہے؟ یا تو ہم جانتے نہیں، یا جانتے ہیں تو سمجھتے نہیں، یا سمجھتے ہیں تو مانتے نہیں، یا مان کر بھی اتنی ایمانداری نہیں دکھاتے کہ سچ کا اعتراف کر سکیں۔ ہمارے مبلغین کے لیے مذہب کا تصور بڑا تاریک اور ڈراؤنا ہے۔ وہ ایمان میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑتے، یوسف سیجا اس تصور سے باہر نکلنے کے کوئی راستہ بتانا نہیں چھوڑتے۔ یوسف سیجا اس فلسفے کی ترویج کر رھے هیں کہ قرآن کے بتائے ہوئے تصور کے ساتھ زندگی نہ صرف ممکن ہے بلکہ خوبصورت ہے۔ وہ امید کا وہ تیشہ ہیں جو جہالت اور خوف کے جمے ہوئے سمندر کو چیر کر راستہ بناتا ہے۔ اسی لیے ان کی اہمیت ہے۔ مذہبی معاملات پر ہمارا رویہ آتش فشاں جیسا ہو جاتا ہے۔ ہم میں سے جو لوگ بڑے نرم مزاج اور ٹھنڈے ہیں، وہ بھی مذہب کے نام پر سخت، پرتشدد اور بدتمیز ہو جاتے ہیں۔ ہماری علمی گفتگو گلی محلے کی گفتگو جیسی ہو گئی ہے جہاں جتنا آپ اونچا بولیں گے، اتنا ہی آپ کو نیک سمجھا جائے گا۔ ہمیں یا تو اندھی عقیدت پسند ہے یا بدترین حملہ، اور دونوں صورتوں میں ہم شائستگی کھو دیتے ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں عدم برداشت سے ایمان کو ناپا جاتا ہو، وہاں ایک ایسا شخص موجود ہے جو اپنے مخالفین کا بھی احترام کرتا ہے اور پوری تہذیب کے ساتھ بات کرتا ہے۔ وہ سید مودودی، سید قطب ، امین

احسن اصلاحی ، حمید الدین خاں اور کئی مفکرین سے اختلاف رکھتے ہوں گے ہیں، مگر ان کے لیے احترام کا پورا اظہار بھی کرتے ہیں۔ وہ دکھاتے ہیں کہ وقار اور اعتماد کے ساتھ اختلاف کیسے کیا جاتا ہے۔ جب ہم دلیل میں ہار جاتے ہیں، تو ہم شک کرنے لگتے ہیں، غصے میں آ جاتے ہیں، الزام لگاتے ہیں اور دوسروں کو بدنام کرنے کے لیے گھٹیا طریقے استعمال کرتے ہیں۔
یہاں یوسف سیجا شائستگی کے ایک ادارے کے طور پر کھڑے ہیں کہ اپنی بات کو آسان اندازمیں سمجھاتے ھیں ایک جدید دانشور کا رویہ ایسا ہی ہونا چاہیے، علم کی روح یہی سکھاتی ھے۔
یوسف سیجا صاحب کسی بات کو روایتی 'میں نہیں مانتا' کے انداز میں رد نہیں کرتے۔ وہ نہ تو مانتے ہیں نہ رد کرتے ہیں، وہ 'کیوں' اور 'کیوں نہیں' کی وضاحت کرتے ہیں۔

کچھ اھل علم کا خیال ھے کہ یوسف سیجا اس دور کے مجتہد کی حیثیت رکھتے ھیں لیکن وہ مجتہد مطلق نہی ھیں ۔ استاد نور احمد سندھی مدظلہ ان کو مجتہد کا درجہ دیتے ھیں ۔ داڑھی، پردہ، موسیقی، سود، عورتوں کے حقوق، سیاست اور وراثت جیسے معاملات کو تاریخ، روایات اور کتاب کی روشنی میں پڑھنا پڑتا ہے۔ یہ سنجیدہ بحثیں ہیں، یہ کوئی 'ہاں یا ناں' والے ریپڈ فائر سوالات نہیں ہیں جو ہمیں بچپن سے سکھائے گئے ہیں۔ وہ چیزوں کو وہیں رکھتے ہیں جہاں ان کی جگہ ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ ایمان کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے۔ مذہب کا انکار کر کے اسے پیش کرنا آسان ہے، ہمت تو اس میں ہے کہ آپ اپنی جڑوں سے جڑے رہیں اور چیزوں کو ویسا دکھائیں جیسی وہ اصل میں ہیں، نہ کہ ویسا جیسا کہ وہ ہم تک پہنچی ہیں۔

ہمارا مسئلہ الٹا ہے۔ ہم شروع کرنے سے پہلے ہی ختم کر دیتے ہیں۔ ہم سمندر سے ایک دو بالٹیاں نکال کر یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ سمندر میں کوئی وہیل مچھلی نہیں ہے۔ ہمیں اپنی بات ثابت کرنے کے لیے زیادہ مطالعہ کرنا چاہیے۔ اگر ہم یوسف سیجا کی دلیل سے اختلاف کرتے ہیں (جو کہ ہمارا حق ہے)، تو پہلے ہمیں ان کی دلیل کی بنیاد کو سمجھنا ہوگا۔ دوسرا، وہ تاریخ میں اکیلے نہیں ہیں جنہوں نے قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور بھی بہت سے لوگ ہیں جنہیں یا تو ہم جانتے نہیں، یا جاننا نہیں چاہتے، یا جان کر بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ لفظوں کو مروڑتے نہیں ہیں جیسا کہ ہم سمجھتے

ہیں۔ انہیں سننے یا سمجھنے کے بعد ان پر تنقید کرنا ایک الگ بات ہے، قرآن کریم کی تعلیمات کا فہم امین احسن اصلاحی اور مشتاق احمد خان نے عام کیا لیکن علامہ یوسف سیجا صاحب کا ایک انوکھا اسلوب ھے جو ان کے علاوہ کہیں اور نہی ملتا ، وہ آج کے نوجوانوں کے ذھن کو خوب جانتے ھیں اور اسی لیئے موضوعات کو سوالات کے جوابات کی صورت میں ترتیب دینے کا سلسلہ بہترین کاوش ھے ۔

علامہ یوسف سیجا قرآن کی تعلیمات کو جدید دور میں متعارف کروانے میں ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان کی تحریروں میں دلائل کی قوت اور ترتیب کی انفرادیت ان کے وسیع مطالعے اور قرآن کریم کے گہرے فہم کی آئینہ دار ھے۔

خدا شناسی میں ان کا رویہ ممتاز فلسفی عمانوئیل کانٹ جیسا ھے ،عمانوئیل کانٹ (1724~ 1804) کہتا ہے " ہم جو کچھ بھی دیکھتے ہیں، وقت اور جگہ (Time & Space) کی دو عینکوں سے دیکھتے ہیں۔ چونکہ خدا وقت اور جگہ کی قید سے آزاد ہے، اس لیے انسانی عقل وہاں تک پہنچنے کے لیے کوئی راستہ نہیں رکھتی ."
کانٹ نے اپنی کتاب Critique of Pure Reason میں واضح کیا کہ جب عقل ماورائی حقائق کے بارے میں سوالات کرتی ہے (جیسے کیا خدا ہے؟)، تو وہ تضادات (antinomies) میں پھنس جاتی ہے. اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عقل ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہے، نہ کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا موجود نہیں. خدا موجود ھے لیکن هماری عقل اس کا احاطہ نہی کر سکتی کیونکہ خدا لا محدود ھے اور انسانی عقل انتہائ محدود تھی اور همیشہ محدود ھی رھے گی اور کھبی بھی خدا کی ذات کا احاطہ نہی کر سکے گی ۔

وہ سمجھتے ھیں کہ ہم ایک لیبارٹری میں ہیں جہاں ہم سیکھتے ہیں۔ دو منٹ کی ویڈیو یا ایک پوسٹر کی چند لائنیں کسی کی علمیت کو جانچنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ ان کی دلیل توجہ مانگتی ہے، !

علامہ یوسف سیجا سمجھتے ھیں کہ

عقل، دانشوری سے پہلے آتی ہے۔ دانشور کہلانے سے پہلے ہمیں نارمل انسان لگنا چاہیے۔ کچھ چیزوں کے لیے صرف عام عقل چاہیے ،جہاں کامن سینس ہوتی ہے وہاں کسی ذہانت کا کمال نہیں ہوتا۔ اپنی عقل کو معطل کر دینے سے ہم اپنے عقیدوں میں اور پکے ہو جائیں گے، چاہے وہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں۔ لیکن ایک بار جب ہم اپنی عقل سے دیکھنا اور محسوس کرنا شروع کرتے ہیں تو سچ سامنے آنے لگتا ہے۔ شور سچ کو خاموش نہیں کر سکتا۔

کئی لوگوں کے برعکس وہ فتاوی پر یقین نہی رکھتے، وہ محض اپنی قرآنی فکر پیش کرتے ہیں تاکہ دوسرے اپنے طریقے سے اس پر سوچ سکیں۔ ان کا مطمع نظر بالکل واضح ھے کہ ہمیں اپنے تعصبات میں قید رہنا پسند ہے۔ ہمیں گہرائی میں جانے کے بجائے سستی شہرت پسند ہے۔ اگر وہ ہمیں ان تصورات سے آزاد کر رہے ہیں جو ہم نے نادانی میں یا غلطی سے قرآن کریم کی تعلیمات سے جوڑ دیے تھے، تو ہم ان کی باتوں کی وجہ سے ان سے اتفاق نہ بھی کر سکیں مگر اس سے بحث ختم نہیں ہوگی۔ یوسف سیجا صاحب کا تاریخ، انسانوں اور واقعات کو بیان کرنے کا انداز من گھڑت نہیں ہے، بلکہ عقل کے مطابق ہے۔

زبان و ادب اور گفتگو کا کوئی بھی طالب علم ان جیسے استاد سے سیکھے گا۔ وہ جس صفائی کے ساتھ اپنی دلیل پیش کرتے ہیں، وہ پڑھے لکھے اور ان پڑھ دونوں کو سمجھ آتی ہے۔ ان کے بیان میں کوئی الجھاؤ نہیں ہوتا۔ صحیح یا غلط سے ہٹ کر، 'وضاحت' ایک سچے مفکر کی نشانی ہے اور اسی لیے وہ روشن چراغ ہیں۔

سب سے آخری بات سب سے اہم ہے۔ ان کے اندر وہ اصول موجود ہیں جن کا وہ پرچار کرتے ہیں۔ ہم میں سے اکثر یہیں ٹھوکر کھاتے ہیں۔ وہ وہاں ثابت قدم رہے جہاں ہمارے بڑے بڑے مبلغین پھسل جاتے ہیں۔ جذبات میں کسی عمل کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لیے جذباتی ہونا آسان ہے۔ کھوکھلے جذبات کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، اصل قیمت وہ ہے جو آپ اس سچ کو کہنے کے لیے چکاتے ہیں جس پر آپ کا یقین ہو۔ ہمارا خدا اور رسول ﷺ سے محبت کا دعویٰ زبانی کلامی تو بڑا میٹھا لگتا ہے، مگر عملاً اس کی ایک قیمت ہوتی ہے جسے ہم برداشت نہیں کر پاتے، مگر وہ برداشت کرتے ہیں .

ان میں یہ تمام خوبیاں اس قدر خوبصورتی سے ملی ہوئی ہیں کہ ہم کہہ نہیں سکتے کہ کون سی خوبی دوسری سے بڑھ کر ہے۔
جب توحید کے بارے میں بیان کرتے ہیں تو ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی کا اسلوب یاد آتا ہے .
ان کی قرآنی فکر موجودہ دور کے نوجوانوں بلکہ آنے والی نسلوں کو قرآن کریم کی جانب مائل کرنے میں ھمیشہ چراغ راہ ھے اور رھے گی۔

علامہ یوسف سیجا کے انوکھے طرز عمل کی بنیاد ان کے سوالات و جواب کا سلسلہ ھے جسکی ایک جھلک ھم یہاں پیش کر رھے ھیں -

نوجوانوں کے سوالات اور ان کے جواب

سوال: قرآن حقائق کو محسوسات کی بجائے تمثیلات کے انداز میں بیان کیوں کرتا ہے؟
جواب:
یہ بات شانِ خداوندی کے منافی نہیں کہ وہ حقائق کو تمثیلات کے ذریعے بیان کرتا ہے اِس لئے کہ بلند حقیقتیں محسوس تشبیہات سے سمجھائی جاسکتی ہیں۔
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْىٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ 2:26
اس آیت میں معاشرہ کو ایک سرسبز وشاداب باغ(جنت) کہہ کرپکاراگیاہےاور اس معاشرے کے افراد کے اعمالِ حسنہ کے نتائج کو لذیذپھلوں سے تشبیہ دی گئی ہے قرآن حکیم نے جنت کا بیان تمثیلی دیا ہے جنت کی نعماء کی تفاصیل قرآن کریم میں بے شمار مقامات میں آئی ہیں یہ تفاصیل درحقیقت طبعی زندگی کی ضروریات کے سلسلے میں ہیں کہ زندگی کو آسائشوں اور آرائشوں کی ضرورت ہوتی ہے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن اشیاء کا نام لے کر بیان آیا ہے تو کیا اس کے علاوہ دوسری ساری چیزیں آسائشوں اور آرائشوں میں شامل نہیں ہیں بات یہ ہے کہ قرآن کی اولین مخاطب عرب قوم تھی لہٰذا جو چیزیں ان کی نگاہوں میں زندگی کی خوشگواریاں سرفرازیاں شادابیاں سیرابیاں تھیں انہیں ہی نمایاں کیا گیا ہے 2:25 ان چیزوں سے ملتی جلتی ہر دور کی چیزیں ہیں

جو ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہوں گی وہ آرائش اور آسائش میں شامل ہونگی اور اسے جنت کی نعمتیں کہا جائے گا جو انسان کو ضابطہ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے نتیجے میں ملتی چلی جائیں گی جب قرآن جنت کے متعلق تفاصیل بیان کرتا ہے تو وہ دنیاوی جنت کی بات کرتا ہے جہاں تک بات جہان فردا کی نعماء کی ہے کوئی فرد زندگی کی موجودہ سطح پر اسے نہیں سمجھ سکتا ہے13:35 وہ جنت جس کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے اس کا بیان تمثیلی ہے یعنی مثال دے کر بات سمجھائی گئی ہے کہ کوئی شخص زندگی کی موجودہ شعور کی سطح پر نہیں جان سکتا ہے کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا سامان کیا گیا ہے جو پوشیدہ ہے اسی لئے بسیط حقیقتوں اور ما بعد الطبیات سے متعلق زندگی کے حقائق کی نوعیتوں کو مثال کے انداز میں سمجھایا گیا ہے کیونکہ اس دنیا کی زندگی میں رہتے ہوئے ہم اس کے کوائف کو نہیں جان سکتے ہیں انسانوں کی زبان میں جو تشبیہات اور استعارات ہیں انہی سے سمجھا جا سکتا ہے اخروی زندگی کی جنت جہنم عذاب ثواب کی نوعیت کیفیت کوائف کو محسوسات سے نہیں تشبیہات سے سمجھا جا سکتا ہےیہ تو خیر پھر بھی باغات اور پھلوں کی مثالیں ہیں اگر ضرورت پیش آئے تو اللہ کو اِس میں بھی کسی قسم کا باک نہیں ہو گا کہ وہ مچھر جیسی حقیر شئے یا اُس سے بھی کسی کمتر چیز کی مثال دے کر بات واضح کر دے۔ جو لوگ اِس پر یقین رکھتے ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے (وحی کے ذریعے) بیان ہو رہا ہے وہ اِن مثالوں سے سمجھ جائینگے کہ یہ اُن کے نشوونما دینے والے کی طرف سے حقیقت ثابتہ ہے۔ لیکن جو لوگ اِس بنیادی حقیقت ہی سے انکار کرتے ہیں بنیادی حقائق کو تسلیم نہیں کرتے تو پھر ان کی ذہنیت زنگ الود ہو جاتی ہے وہ ان تمثیلات اور تشبیہات میں بھی ہزار نقص نکالیں گے اور کہیں گے کہ اِس قسم کی مثالوں سے بالآخر مقصد کیا ہے؟قرآنی تشبیہات کو اگر تشبیہات کے انداز میں نہ سمجھا جائے تو فتنہ پیدا ہوتا ہے قرآن کے اندر جو بنیادی ضابطہ ہے یعنی قوانین اصول اقدار یہ تو بالکل محکم انداز اور بالکل ٹھوس انداز متعین مفہوم کو لئے ہوئے ہیں لیکن جن چیزوں کا تعلق بسیط حقائق سے ہے انہیں تشبیہات کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے اب جن کے دلوں کے اندر شرارت بھری ہوتی ہے اور جو فتنہ پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ کرتے یہ ہیں کہ جن چیزوں سے تشبیہ دی جاتی ہے ان کو مقصود بالذات سمجھ لیتے ہیں مثال کو مثال اور تشبیہ کو تشبیہ نہیں سمجھتے ہیں جو بات تشبیہا" کہی گئی ہے اس کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرنی

چاہئے جو مشبہ بہ ہے یعنی جس کی مثال یا تشبیہ کے ذریعے تشریح کی گئی ہے اس کو بسیط حقیقت نہیں سمجھنا چاہئے یعنی یہ بعینہٖ وہی چیز نہیں ہے جو کہی گئی ہے یہ تو انسان کے ذہانت پر ہے کہ وہ تشبیہ سے حقیقت کے متعلق کتنی چیز اخذ کر سکتا ہے ظاہر ہے کہ جتنا زیادہ غور و فکر کرے گا تشبیہ سے مشبہ بہ کی وضاحت زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جائے گی جو فاسق ہوگا جس کو فتنہ برپا کرنا ہے وہ تو یہ کام نہیں کرے گا .

اِس سے سمجھ لو کہ ایک ہی بات سےکسطرح دو متضاد نتیجے اخذ کئےجا سکتے ہیں فرق زاویہ نگاہ کا ہوتا ہے۔ ایک اندازِ نگاہ سے دیکھو تو اُسی سے گمراہی کےراستوں پر جاپڑو۔ اور دوسری نگاہ سے دیکھو تو اُسی سے کامیابیوں اور کامرانیوں کی راہیں کشادہ ہوجائیں۔

زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے اشیاء کی ماہیت بدل جاتی ہے اگر ایمان ہو تو انسان کی نگاہ کا زاویہ درست ہو جاتا ہے اور یوں ہر شئے اپنی اصلی حقیقت میں نظر آتی ہے چیز ایک ہی ہوتی ہے لیکن ہر انسان اپنی اپنی نگاہ کے مطابق تاثر لیتا ہے خدا کا قانون یہ ہے کہ جیسے ہی انسان کی نگاہ کا زاویہ بدلتا ہے اس بدلے ہوئے زاویہ نگاہ کے مطابق وہ تاثر لیتا ہے جس کی نظر کا زاویہ غلط سمت پر پڑ جائے اسے فسق کہتے ہیں الْفٰسِقِيْنَ غلط راہوں پر صرف وہ لوگ چل نکلتے ہیں جو قوانین خداوندی کے قالب کے اندر زندگی بسر کرنا نہیں چاہتے بلکہ اِن سے گریز کی راہیں نکال کر اپنے لئے ایک الگ راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔

فسق کا تفصیلی مفہوم یہ ہے کہ اس چیز کو جس میں پھل اپنے چھلکے سے نکل کر بے راہ رو ہو جائے فسق کہتے ہیں کیونکہ درخت سے الگ ہو کر اب اسے سامان نشونماء پہنچ نہیں رہا ہوتا ہے وہ اپنے قالب سے باہر آگیا ہوتا ہے یہ نظام یہ پیٹرن یہ معاشرے کی پابندیاں یہ معاشرے کا قالب بہت ضروری ہوتا ہے اس کے اندر رہ کر انسان کی انسانیت نشونماء پاتی ہے اس آیت میں یہی بات بیان کی گئی ہے کہ جو اس پیٹرن قالب کے اندر رہنے والے لوگ ہیں وہ بہت خوب جانتے ہیں کہ یہ بات کیوں کہی گئی ہے یا یہ مثال کیوں دی گئی ہے۔

سوال: نظام اللہ قائم کرتا ہے یا انسان قائم کرتا ہے دنیا میں جنت کیسے حاصل ہوتی ہے؟

جواب:
وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَـــرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ2:25

جنت اور جہنم کا دارومدار انسانوں کے اس نظام سے وابستہ ہے جو وہ خود قائم کرتے ہیں کائنات میں از خود خدا کا نظام کار فرما ہے اور سرگرم عمل ہے انسانوں کی دنیا میں یہ نظام انسان خود قائم کرتے ہیں وہ اس طرح کہ قوانین خداوندی اور زندگی کی بلند اقدار کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں اور خداکے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہتےہیں یعنی اس کے مطابق اعمال صالحہ سے مزین نظام قائم کرتے ہیں انہی کے لئے کہا گیا ہے کہ اے رسول! تو اِنہیں خوشخبری دیدے کہ اِن کے لئے ایک ایسا معاشرہ متشکل ہوجائے گا جس کی شادابیاں سدا بہار اور جس کی آسائشیں زوال نا آشنا ہوں گی اِس زندگی میں بھی خزاں نادیدہ بہاریں اور بعد کی زندگی میں بھی حیات جاوید ۔

جب اور جہاں بھی کسی جماعت نےایسی روش اختیار کی اسکا نتیجہ جنت نکلا ان اعمال کے نتائج ہمیشہ ایک جیسےہو تے ہیں البتہ انکے پیکر زمانے کے بدلتےہوئےتقاضوں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ رزق پر ذاتی ملکیت کے تصور سے پہلے کی تمدنی زندگی کو قرآن نے جنتی زندگی سے تعبیر کیا ہے یہ جنت کی زندگی کیا ہوتی ہے 2:35,20:118, 20:119 اس زندگی کے اندر انسان کو بھوک کا خوف نہیں ہوتا ہے نہ پیاس کا خوف ہوتا ہے اور نہ لباس کی محتاجی ہوتی ہے موسم کی سردی گرمی نہیں ستاتی ہے یہی جنہیں ہم بنیادی ضروریات زندگی گنتے ہیں یوں سمجھو گویا یہی جنتی زندگی کہلاتی ہے کہ جہاں سے جس کسی کا جی چاہے اور جب بھوک لگے وہ سیر ہو کر رزق سے خوب خوب متمتح ہوتا رہے لیکن جب مستبد انسان رزق کے سرچشموں پر ذاتی ملکیت کے دعویدار بن بیٹھتے ہیں میری اور تیری کی لکیریں کھینچ دیتے ہیں اور خدا کے بندوں کے لئے خدا کی زمین کھلی نہیں رہنے دیتے ہیں بلکہ تنگ کر دیتے ہیں اور تقسیم کا یہ عالم ہوتا ہے کہ فراوانیاں تنگیوں میں بدل جاتی ہیں بنیادی ضروریات زندگی سے بھی محرومی اور محتاجی ہو جاتی ہے یہ غلط نظام کی وجہ سے ہوتا ہے جسے جہنم کی اصطلاح سے پکارا جاتا ہے انسان صحیح نظام میں رہتے ہوئے غلط نظام کی طرف چلا جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایتیں ملتی ہیں اب جو گروہ اس کے مطابق زندگی کا

نقشہ بنا لیتا ہے جس کو نظام کہتے ہیں تو اسے جنت مل جاتی ہے اس جنت کی بازیافت اسی ارض پر ممکن ہے.

اس کا طریقہ یہ ہے کہ اِس معاشرہ میں اِن کے ساتھ اور لوگ بھی ملتے جاتے ہیں جو ان کے رفیق بنتے جاتے ہیں یہ بھی اِن ہی جیسی پاکیزہ سیرتوں کے حامل ہوتے ہیں9:119,89:29,89:30 فرد کو جنت نہیں مل سکتی یہ فریب نفس ہے اس قسم کے رفیقوں کے ساتھ مل جاؤ تو جنت بن جائے گی جنت تو انسان مل کر تعمیر کرتے ہیں جنتی معاشرے میں گروہ بندی کے سلسلے میں زوج کا قرآنی ہی مفہوم ہی یہ ہے کہ ایسے رفیق جن کے ساتھ ملے بغیر اس کی اپنی تکمیل نہ ہو تبھی تو کہا گیا ہے کہ میرے بندوں میں شامل ہو جاؤ کیونکہ انفرادی زندگی میں انسانی ذات کی برو مندی نشونماء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے جب کوئی دوسرا انسان آپ کے ساتھ ہوتا ہے تو اس طرح اس کی بھی اور آپ کی بھی تکمیل ہوتی ہے اسے قرآن زوج کہتا ہے اس قسم کا ساتھی کہ جس کے ساتھ مل کر دونوں کی نشونماء ہو۔جائے2:23 یہ وہ ساتھی ہیں جن کے ساتھ مل کر جنت بنتی ہے 2:25 جنتی معاشرے میں افسردگی وپژمردگی کا نشان تک نہیں ہوتا ہے فکر قرآنی سے پیدا کردہ جوئے شیر انسانی قلب و نگاہ کو کبھی پژمردہ نہیں ہونے دیتی 14:25 خدا کے قانون کے مطابق وہ ہر موسم میں وہ نظام اپنا پھل دیتا چلا جاتا ہے.

جب تک یہ معاشرہ قوانین خداوندی کی بنیادوں پر استوار رہے گا یہ اپنے پھل اِسی طرح دیتا جائے گا اِس میں فساد اور تغیر واقع نہیں ہو گا۔جب تک کہ انسان کی اپنی ذات کے اندر تغیر اور فساد پیدا نہیں ہو جاتا ہے اگر اس کے دل پتھر ہو جائیں گے تو پھر باغات پتھروں سے تو سیراب نہیں ہوتے ہیں 2:132 مرتے دم تک مسلم رہنا ہے کائنات کی ہر شئے کے مقابلے میں صرف انسانی ذات ہے جو کہ ایک غیر متبدل شئے ہے یہ جو انسان کو سامان زیست دیا جاتا ہے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے لیکن انسانی ذات نہیں بدلتی ہے جسمانی ضروریات کو بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق سامان نشوونماء ملنا چاہئے اگر اس طرح رزق ملتا ہے تو یہ رحمانیت کا خاصہ ہے کہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق سامان زیست ملنا چاہئے2:25 جب بھی ان کو ان باغوں میں سے کوئی پھل کھانے کو ملے گا تو وہ کہیں گے یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا اور ملے گا ان کو ایک دوسرے

سے ملتا جلتا ۔ جسم انسانی کی نشوونماء کے ساتھ ساتھ انسانیت کی نشونماء کے تقاضے بھی پورے کرنا ضروری ہیں یہی جنت ہے کہ سامان زیست میں تنوع ہو جسم کی پرورش کے لئے ہو انسانی صلاحیتوں کی پرورش کے لئے ہو ضرورت کے وقت ملے ہر ایک کو ملے زمانے کے تقاضوں سے چاہے اس کی صورتیں بدلتی چلی جائیں لیکن جو چیز اس میں غیر متبدل ہے اس کے اعتبار سے وہ چیز اپنا نتیجہ غیر متبدل پیدا کرتی رہے انسان کی انسانیت کی زمانے کے تقاضوں کے مطابق نشونماء ہوتی چلی جائے انکار کرنے والوں کے برعکس اقرار کرنے والوں کے نظام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو اس دنیا میں بھی جنت کی زندگی مل
جاتی ہے یعنی جس میں سامان زیست کی فراوانیاں اور شادابیاں ہوتی ہیں.

سوال :اللہ کا قانون ,,مکافات عمل،، کیا ہے؟
جواب:
جس طرح انسان کے طبعی افعال کا نتیجہ طبعی قوانین کے مطابق مرتب ہوتا ہے اسی طرح انسان کے انسانیت پر مبنی اعمال کا نتیجہ مستقل اقدار کے قوانین کے مطابق نمودار ہوتا ہے اسے اللہ کا قانون ,,مکافات عمل،، کہا جاتا ہے۔درحقیقت انہی اقدار سے انسانی ذات کی نشونماء ہوتی ہے اور ان اقدار کی خلاف ورزی سے انسانی ذات میں ضعف اور ابتری پیدا ہو جاتی ہے۔مستقل اقدار سے نشونما یافتہ ذات طبعی جسم کی موت کے بعد بھی آگے چلتی ہے جسے حیات آخرت کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو فکر و عمل اور ارادہ و انتخاب یا کسب و ہنر کی آزادی بطور امانت ودیعت کی ہے اور اسی آزادی کے عوض انسان اللہ کے قانون ,,مکافات عمل،، کا مستوجب ہے۔پیغمبر انزار و بشارت کا طریقہ اختیار کرتے ہیں جو نبوت کا ہدف ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضابطہ قوانین رشد و ہدایت پر مبنی کتاب کی صورت میں ملتا ہے مقصد صرف ایک ہوتا ہے کہ انسانوں کو اللہ کے قانون مکافات عمل سے آگاہ کیا جائے تاکہ وہ ان اعمال کے نتائج کے دن یعنی آخرت (مستقبل) پر ایمان لے آئیں۔

سوال: پوری دنیا بشمول مسلمانوں کے سبھی قرآن کی تعلیمات کے بغیر زندگی گزار رہے ہیں پھر اسلامی زندگی پر زور کیوں دیا جاتا ہے؟
جواب:
وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ 2:23
اس آیت میں قرآن نے خود اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ انسان اپنی زندگی کے مختلف شعبوں جیسے عائلی زندگی معاشرتی زندگی معاشی زندگی سیاسی زندگی ایک دائرے کے اندر بسنے والی ایک جماعت کی زندگی بین الاقوامی زندگی عالمگیر انسانیت کی زندگی اس دنیا کی زندگی آنے والی دنیا کی زندگی سب کے متعلق جو جو تعلیمات ہیں ان سے ایک عظیم الشان عمارت بنا سکتا ہے لیکن جو عمارت قرآن کی تعلیمات کی بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہے اس کا مقابلہ ناممکن ہے یہ قرآن کا دعویٰ ہے جسے قرآن کا معجزہ کہا جاتا ہےجو ضابطہ زندگی اللہ نے اپنے بندے کی وساطت سے دیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے اِنسانی زندگی کے لئے جو نقشہ یہ ضابطہ پیش کرتا ہے اُس کے بجائے کوئی متبادل نقشہ مرتب کرکے دِکھایا تو جا سکتا ہے لیکن اِس ضابطہ کی کسی ایک شق جیسی شق بنا کر لایا نہیں جا سکتا ہے اِس کے لئے کسی ایک شخص پر ذمہ داری ڈالنے کی ضرورت نہیں۔

جتنے ادیب ومفکر اور تمدنی اور سیاسی مقنن تمہارے معاشرہ میں پائے جاتے ہوں اِن سب کی ایک کمیٹی بنا لو بس ایک اللہ کی وحی کو الگ چھوڑ دو۔ اور اُن سے کہو کہ ایسا کرکے دکھائیں۔کلام تو قرآن سے پہلے بھی تھا اور کلام قرآن کے بعد بھی ہے کتابیں قرآن سے پہلے بھی تھیں اور کتابیں قرآن کے بعد بھی ہیں آیات اور سورتیں قرآن سے پہلے بھی موجود تھیں لیکن قرآن کی آیات اور سورتوں کی مثل کوئی نہیں ہے۔

انسانیت کی رہنمائی کے لئے اس سے بہتر کتاب نہیں لائی جا سکتی ہے قرآن ایسا ضابطہ حیات ہے جو زندگی کے کسی ایک میدان کے اندر ہی نہیں بلکہ زندگی کے تمام میدانوں کے اندر نوع انسانی کے لئے مستقل طور پر زمانوں کے تقاضوں سے بلند و بالا ہو کر رہنمائی دیتا ہے انسانوں نے جو بھی اپنے ہاں نظام ہائے زندگی ترتیب دیا ہے یا وضع کیا ہے وہ قرآن کے مقابلے پر رکھ کر دیکھ سکتا ہے قرآن کی تعلیم انسانی زندگی کے تمام گوشوں اور پہلوؤں کو

ساتھ لے کر چلتی ہے اور انسانی ذہن جو نظام بناتا ہے اس میں زندگی کے جزوی گوشوں اور پہلوؤں کو روشن کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کے دوسرے گوشے اور پہلو تاریک رہ جاتے ہیں.

دنیا کی جتنی بھی فلاحی ریاستیں ہیں اس میں خودکشی کی وارداتیں زیادہ ہوتی ہیں ان ریاستوں نے انسانیت کا مسئلہ صرف ضروریات زندگی کو سمجھا تھا جو انہوں نے حل کر دیا انسان جب بھی کوئی نظام بنائے گا کچھ گوشے اور پہلو روشن ہو جائیں گے اور دیگر گوشے اور پہلو تاریک رہ جائیں گے قرآن کلی انسان کو لیتا ہے انسان کی پوری زندگی اس کے تمام پہلوؤں اور تمام گوشوں کو لیتا ہے اور ہر ہر جزو پر بات کرتا ہے اور پھر اس کا دعویٰ ہے کہ انسانوں کا وضع کردہ کوئی نظام کوئی قانون قرآن جیسی رہنمائی نہیں دے سکتا .

سوال: کیا قرآن نے انسانی زندگی سے متعلق مکمل ضابطے کو ترتیب دے کر نظام بنا کر دیا ہے؟

جواب:

جو کچھ قرآن کہنا چاہتا ہے وہ زندگی کے مختلف گوشوں مختلف پہلوؤں سے متعلق رہنمائی کی صورت میں دیتا ہے پورے کے پورے نظام کی صورت میں نہیں دیتا ہے یہ تمام گوشے جمع ہوکر مجموعی طور پر انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہو جاتے ہیں یوں قرآن کریم ایک کلی ضابطہ بنتا ہے مکمل ہدایت نامہ بنتا ہے قرآن کریم نے حیات کے مختلف شعبوں جیسے عائلی زندگی معاشی زندگی سیاسی زندگی ایک دائرے کے اندر بسنے والی ایک جماعت کی زندگی بین الاقوامی زندگی عالمگیر انسانیت کی زندگی اس دنیا کی زندگی آنے والی دنیا کی زندگی سے متعلق بات کی ہے قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اور آیات میں بٹا ہوا ہے اور آیات ایک سورت کے اندر جمع ہیں۔آیت ایک علامت یا نشانی ہوتی ہے اس علامت یا نشانی سے کسی چیز کا پتہ لگایا جا سکتا ہے انسان مخلوق کے ذریعے سے خالق کا اندازہ لگا سکتا ہے سورت کا مفہوم کسی مکان کی ایک منزل کو سمجھ لیجئے.

سوال: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ   اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو۔ رب کی عبادت سے کیا مراد ہے؟
جواب:
2:21 میں رب کی تعریف کچھ یوں ہے
الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔آیت کے اس ٹکڑے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہاں بات نظام ربوبیت کی ہو رہی ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نوع انسان کی ربوبیت کرتا چلا آ رہا ہے تبھی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ نوع اب تک چلی آرہی ہے ۔یہاں رب کی عبادت کا حکم ہے رب کی عبادت کا مطلب ہے کہ صفت ربوبیت کو انسان اپنے لئے معروضی معیار بنائے اور خدا کی اس صفت کے پیچھے پیچھے چلتا چلا جائے اسے رب کی عبادت کہتے ہیں رب کی عبادت پرستش کا کوئی طریق نہیں ہے وہ تو رسومات ہیں جن کی اہمیت اپنی جگہ ہےتمہیں چاہئے کہ اپنے آپ کو اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین کے تابع لے آؤ اسے عبادت کہتے ہیں ۔عبادت پرستش کا کوئی طریق اس لئے نہیں ہے کہ آیت کے آخر میں آتا ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ تاکہ تم دوزخ سے بچ جاؤ یا خطرناک گھاٹیوں سے بچ جاؤ یاراستے کے خطرات سے محفوظ رہ سکو ۔اگر عبادت کا مطلب پرستش ہوتا تو لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کہنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی یہ صفت ربوبیت ہی تھی کہ اس نشوونماء دینے والے نے تمہیں اور تمہارے آبا و اجداد کو پیدا کیا اور کائنات کی اِسقدرتخریبی قوتوں کے باوجود نسل انسانی کو مختلف مراحل میں سے گذارتے ہوئے اِس مقام تک لے آیا لہٰذا حکم ہے کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ صفت ربوبیت کو انسان اپنے لئے معروضی معیار بنائے اور خدا کی اس صفت کے پیچھے پیچھے چلتا چلا جائےاور اپنے آپ کو اپنے نشوونماء دینے والے کے قوانین کے تابع لے آئے۔

انسان خدا کے وہ کون سے ربوبیت سے متعلق قوانین ہیں جن کے تابع خود کو لا سکتا ہے؟
2:22 الَّذِىْ جَعَلَ لَـكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّـكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ
خدا کے عالمگیر نظام کی حفاظت نے نوع انسان کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے جس کے مطابق اُس نے تمہارے لئے زمین میں ٹھکانے کا سامان پیدا کر دیا ہے۔ اُوپر فضا میں کرّے بکھیر دیئے ہیں تا کہ باہمی کشش و جذب سے

یہ اپنی اپنی جگہ برقرار ہیں۔ پھر ایسا انتظام کر دیا کہ آسمان سے پانی برسے جس سے تمہارے لئے سامانِ رزق پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام سامانِ زیست تمہیں خداکی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو کھلے طور پر اس کے استعمال کی اجازت ہے لیکن جسے خدا نے شرک کہا ہے جس سے روکا ہے فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ پس تم کسی کو اللہ کے برابر نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم جانتے ہو۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جب معاشرہ سرطانی اداروں کی آماجگاہ بن جائے یعنی اس میں فرعونیت ہامانیت قارونیت آزاریت کے سرطانی امراض پیدا ہو جائیں جن نعمتوں کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے وہ اللہ کی ملکیت کی بجائے انسان اپنی ملکیت میں لے لے اللہ کی کھلی اجازت کی بجائے.

سوال: اللہ کے قانون مشیت سے کیا مراد ہے؟

جواب:

(1)قانون مشیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نےاپنے اختیار کو غیر متبدل قوانین کی شکل دے رکھی ہے یعنی اپنے اختیار کو قوانین کے سانچے میں ڈھال رکھا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیار کو قوانین کی شکل میں پابند کر دیا ہے اسے اللہ کا قانون مشیت کہتے ہیں

(2) امر کے معنی ارادہ کے ہیں یعنی چاہنا ۔اور جب اسی ارادے کے مطابق وہ بات وجود میں آجائے تو اس کا نام مشیت ہے

36:82 اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـــًٔا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ اُس کا قانونِ تخلیق یہ ہے کہ جب وہ کسی شئے کے پیداکرنے کاارادہ کرتا ہے تو اس ارادہ کے ساتھ ہی اس شئے کی تخلیق کی ابتداء ہوجاتی ہے۔اسے مشیت کہا جاتا ہے۔

(3) اس عالم مشیت سے پہلے یا عالم خلق سے پہلے یا عالم محسوسات سے پہلے عالم امر تھا

7:54 اَلَا لَهُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ ؕ یاد رکھو! یہ عالم محسوسات(الۡخَلۡقُ) اور اس کے ماوراء (وَالۡاَمۡرُ)وہ عالم جہاں سے اِس کائنات کی تدبیر امور ہوتی ہے سب خدا کے متعین فرمودہ پروگرام کی تکمیل میں مصروفِ کار ہیں۔جن امور کا تعلق عالم امر سے ہے ان میں کوئی قانون نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالی کا ارادہ کار فرما ہوتا ہے۔22:14 اِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يُرِيۡدُ اور وہ اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق جیسا چاہتا ہے ویسا کرتا ہے یہ سب کچھ خدا کے اُس قانون مکافات کے مطابق ہوتا ہے جسے اُس نے اپنے منشاء اور ارادے کے مطابق ایسا بنایا ہے۔اس کے بعد

اللہ تعالیٰ کا امر قوانین کا پابند ہو جاتا ہے 33:38 وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۙ اللہ کا قانون اس کی مشیت کی رو سے مقرر شدہ پیمانوں کے مطابق بنتا ہے۔ ہنگامی حوادث سے متاثر ہو کر نہیں بنا کرتا۔اِسی لئے وہ غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے65:3 قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا اللہ نے ہر بات کے لئے پیمانے اور اندازے (قوانین وضوابط) مقرر کر رکھے ہیں اور یہ اس کی مشیت کے طور پر کام کرتے ہیں ہر شئے اس کی اسکیم کے مطابق وجود میں آتی ہے اور جو کام قاعدوں اور ضابطوں کے مطابق ہوں ان میں نہ عدم یقین ہو سکتا ہے نہ دشواری۔انسانی حیات سے متعلق جومستقل اقدار ہیں ان سب کے لئے بنے ہوئے قوانین اللہ تعالیٰ کی مشیت کہلاتے ہیں انسان کی اجازت کا انسان پابند ہو جائے تو یہ خدا کے ساتھ شرک ہے انسانوں کو خدا بنا دینا ہے رب کی عبادت کا مطلب یہ ہے کہ جن پر خدا کی ملکیت ہے اور جن کی صرف استعمال کے لائق اجازت ہے اس کا مالک انسان کو بنا دینا رب کی عبادت کا انکار ہے خدا کے ساتھ شرک ہے اور انسانوں کو خدا بنا دینا ہے انہیں تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کھلا رہنا چاہئے ۔

سوال: جماعت مومنین ایک قوم ہے یا امت ہے؟

جواب:

قرآن مجید میں جماعت مومنین کے لئے قوم کا لفظ استعمال نہیں ہوا کیوں کہ اسلام میں امت کی تشکیل آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ہوتی ہے جبکہ قوم نسب کی بنیاد پر یا زبان کی بنیاد پر یا حدود اربع یعنی ایک ملک کے رہنے والوں کو کہتے ہیں اسلئے مومنین کی جماعت کیلئےامت کا لفظ آیا ہے،امت کا مطلب ہے:

امت بمعنی مشرب=طریق زندگی،نظریہ حیات
ہم مشرب افراد
امت بمعنی مسلک=الزحرف 22،الانبیاء92 المؤمنون 52،
امت بمعنی جماعت=الاعراف 159، 168، آل عمران 113،المائدہ 66،
امت مسلمہ =النحل 120،البقرہ 143،آل عمران 109
امت بمعنی امم سابقہ=البقرہ 141،134
امت بمعنی قوم= الاعراف 34

سوال: کیااسلام نے معاشی و معاشرتی مسائل کا حل پیش کیا ہے؟
جواب:
مذہب مشینوں سے مطابقت نہیں رکھتاہے مذہب صنعتیں لگانے کی ترغیب نہیں دیتا ہے . معاشرتی خرابیاں افراط و تفریط کا شاخسانہ ہوتی ہیں مذہب معاشرتی خرابیوں کی نشاندہی کرتا ہےجس سے امتیازی اور غیر مساوی گروہ بندیاں وجود میں آتی ہیں اور یوں آدمیت زوال کا باعث بن جاتی ہے چونکہ انسان سدا انسان ہی رہتا ہے چاہے اس کا تعلق کسی دور سے بھی ہو مسئلہ بنیادی طور پرانسان کے مسائل ہیں جب انسان مخصوص حالات سے گزرتا ہے تو وہ مسائل سے دوچار ہوتا ہے لہٰذا ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ کے عظیم قانون کے تابع خود کو لے آئے جو انسانی سرشت سے مطابقت رکھتا ہے یہی وہ ایک راستہ ہے جس سے تمام معاشی اور معاشرتی مسائل کا خاتمہ ہو سکتا ہے.

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس طرح عالمگیر نوع انسانی یا انسانیت کی اصلاح ہو سکتی ہے اس کا جواب صرف یہ ہے کہ فرد واحد کو چاہئے کہ وہ بہر کیف اپنی اصلاح کی کوشش کرے اور اس یقین اور اعتماد کے ساتھ کرے کہ اس کی یہ تمام کاوشیں دنیاوی توازن کے لئے اہم ہیں.قرآن دنیا و آخرت کائنات اخلاق حسنہ احترام آدمیت جنت جہنم وغیرہ کی بات کرتا ہے اللہ صرف انسان سے کلام کرتا ہے قرآن صرف اللہ اور انسان کے قریبی تعلق کی وضاحت کرتا ہے کہ اللہ کی پہچان کیسے کی جا سکتی ہے اور اللہ کی پناہ میں کیسے آیا جا سکتا ہے قرآن کتاب الٰہی کا مقصد بتلاتا ہے کہ انسانوں کے درمیان انصاف قائم کرنے کی تعلیم اس کتاب کے اندر ہے محمد ص انسانوں کے لئے بہترین نمونہ ہیں قرآن ایمان اسلام مسلم کی درست وضاحت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ شرک اور نفاق سے انسان کو کیا نقصان پہنچتاہے ہدایت اور گمراہی میں فرق کی وضاحت کرتا ہےاچھے اور برے اعمال کیا ہوتے ہیں اس کی تعلیم دیتا ہے قرآن نے معیشت معاشرت اور سیاست سے متعلق کچھ اصول دیئے ہیں.کہ اگر ان اصولوں کی بنیاد پر معیشت معاشرت اور سیاست کی عمارت کی بنیاد رکھی جائے گی تو انسان مسائل کا شکار نہیں ہوگایہ نہیں بتایا کہ اس عمارت کی اینٹیں کہاں لگنی چاہئیں اور اس کے دروازے کیسے ہونے چاہئیں اور اس میں لفٹ ہونی چاہئے یا سیڑھی ہونی چاہئے.

علامہ یوسف سیجا اور معاصر قرآنی فکر

علامہ یوسف سیجا کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ وہ کسی فرد کا نام نہیں، بلکہ ایک **فکری رویّے** کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی اصل پہچان نہ شہرت ہے، نہ پیروکاروں کی تعداد، اور نہ ہی کسی مکتبِ فکر سے وابستگی؛ بلکہ ان کی شناخت اس قرآنی منہج سے بنتی ہے جو عقل، وحی اور انسانی تجربے کے درمیان ایک بامعنی اور باوقار ربط قائم کرتا ہے۔ وہ مذہب کو نہ ماضی کا جامد ورثہ بناتے ہیں اور نہ حال کے تقاضوں کے نام پر اس کی روح مسخ کرتے ہیں، بلکہ اسے ایک ایسی زندہ حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو ہر دور میں انسانی زندگی کی رہنمائی کی صلاحیت رکھتی ہے۔

یوسف سیجا کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ ایمان اور عقل کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک عقل ایمان کے لیے خطرہ نہیں بلکہ اس کی فہم کا دروازہ ہے۔ وہ اس تصور کو رد کرتے ہیں کہ مذہب کو بچانے کے لیے عقل کو معطل کرنا ضروری ہے۔ ان کی فکر میں ایمان وہ کیفیت نہیں جو سوال سے ٹوٹ جائے، بلکہ وہ شعور ہے جو سوال سے نکھرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نوجوان ذہنوں کے سوالات سے گھبراتے نہیں، انہیں دباتے نہیں، بلکہ انہیں فکری ارتقا کا قدرتی مرحلہ سمجھتے ہیں۔

علامہ یوسف سیجا کا اسلوب خطیبانہ نہیں بلکہ تعلیمی ہے۔ وہ سامع یا قاری کو مرعوب کرنے کے بجائے اس کے ساتھ مکالمہ کرتے ہیں۔ وہ فتوٰی صادر کرنے کے بجائے قرآنی اصول واضح کرتے ہیں اور قاری کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ خود غور کرے، سمجھے اور نتیجہ اخذ کرے۔ یہ رویہ مذہبی تاریخ میں ہمیشہ سے اصل اہلِ علم کا خاصہ رہا ہے، مگر ہمارے عہد میں یہ وصف نایاب ہو چکا ہے۔ اسی کمی کو یوسف سیجا اپنی فکر سے پورا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ان کی فکر کی ایک بڑی قوت یہ ہے کہ وہ مذہب اور مذہبی تعبیر کے درمیان فرق واضح کرتے ہیں۔ وہ یہ سمجھاتے ہیں کہ خدا کی طرف سے آنے والا دین کامل ہے، مگر انسان کی سمجھ، تشریح اور اطلاق ہمیشہ انسانی حدود کا پابند رہتا ہے۔ یہی نکتہ بہت سے مذہبی تنازعات کی جڑ ہے، اور یہی نکتہ یوسف سیجا کے ہاں فکری دیانت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ وہ نہ روایت کو گراتے ہیں

اور نہ اسے ناقابلِ سوال بتاتے ہیں، بلکہ اسے ایک مسلسل علمی سفر کا حصہ سمجھتے ہیں۔

معاشرت، معیشت، سیاست، عورت کے حقوق، عبادات اور اخلاقیات جیسے حساس موضوعات پر ان کا انداز خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ وہ ان مسائل کو محض "حلال و حرام" کے خانوں میں قید نہیں کرتے بلکہ تاریخ، سماجی تناظر اور قرآنی مقاصد کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ ان کا اصرار یہ ہے کہ قرآن انسان کو ایک متوازن، باوقار اور قابلِ عمل زندگی دینے آیا ہے، نہ کہ اسے خوف اور احساسِ جرم میں مبتلا کرنے کے لیے۔

سب سے بڑھ کر، یوسف سیجا مذہبی گفتگو کو شائستگی واپس دیتے ہیں۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں اختلاف کو کفر اور تنقید کو دشمنی سمجھ لیا گیا ہو، وہ اپنے مخالفین سے بھی احترام کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ وہ یہ عملی طور پر دکھاتے ہیں کہ مضبوط دلیل کے لیے بلند آواز یا تلخ زبان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کا یہ رویہ محض اخلاقی نہیں بلکہ گہرا علمی پیغام رکھتا ہے کہ علم کی اصل طاقت وقار میں ہے، نہ کہ شور میں۔

آخرکار، علامہ یوسف سیجا کی فکر ہمیں کسی نئے "ازم" یا کسی نئی شخصیت پرستی کی دعوت نہیں دیتی۔ وہ ہمیں یہ نہیں کہتے کہ ان کے پیچھے چلو، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ **قرآن کی طرف لوٹو**، **عقل کو ساتھ لے کر**۔ ان کی فکر کو قبول کرنا بھی ایک فکری انتخاب ہے اور اس سے اختلاف کرنا بھی ایک علمی حق اور یہی بات انہیں ایک سچے مفکر کے طور پر ممتاز کرتی ہے۔

اگر آنے والی نسلیں مذہب کو خوف کے بجائے فہم، جبر کے بجائے اختیار، اور تقلید کے بجائے بصیرت کے ساتھ سمجھنا چاہیں، تو علامہ یوسف سیجا کی قرآنی فکر ایک اہم حوالہ بنی رہے گی۔ وہ اس دور میں امید کی اس شمع کی مانند ہیں جو یہ یاد دلاتی ہے کہ مذہب انسان کے خلاف نہیں، بلکہ انسان کے لیے ہے بشرطیکہ اسے سمجھنے کا حوصلہ زندہ رکھا جائے۔

علامہ یوسف سیجا .. فہمِ دین کی ایک سنجیدہ کوشش

علامہ یوسف سیجا کی فکر کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ وہ نہ کسی نئی راہ متعارف کرواتے ہیں اور نہ کوئی نیا مذہبی لیبل پیش کرتے ہیں۔ وہ دراصل ہمیں سوچنے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔ ان کی دعوت یہ نہیں ہوتی کہ "میری بات مان لو" بلکہ یہ ہے کہ قرآن کو سمجھو، عقل کو استعمال کرو، اور پھر خود فیصلہ کرو۔ یہی رویہ انہیں ہمارے عہد کے مذہبی ماحول میں منفرد بناتا ہے۔

آج کا نوجوان مذہب سے اکثر اس لیے بدظن نظر آتا ہے کہ اسے یا تو سوال کرنے سے روکا جاتا ہے، یا اختلاف کی قیمت بدتمیزی، الزام اور خوف کی صورت میں ادا کرنا پڑتی ہے۔ یوسف سیجا اس فضا کو بدلنے کی سنجیدہ کوشش کرتے ہیں۔ وہ اعتماد کے ساتھ یہ مؤقف پیش کرتے ہیں کہ اگر قرآن واقعی خدا کا کلام ہے تو وہ انسانی عقل سے خوفزدہ نہیں ہو سکتا۔ ان کے نزدیک ایمان وہ شے نہیں جو سوال سے ٹوٹ جائے، بلکہ وہ شعور ہے جو سوال کے بعد مزید مضبوط ہوتا ہے۔

یوسف سیجا کا ایک اہم فکری کارنامہ یہ ہے کہ وہ دین اور دین کی انسانی تعبیر کے فرق کو نمایاں کرتے ہیں۔ وہ سادہ اور واضح الفاظ میں سمجھاتے ہیں کہ دین خدا کی طرف سے کامل ہے، مگر دین کو سمجھنے، بیان کرنے اور نافذ کرنے والے انسان ہیں، اور انسان خطا سے پاک نہیں۔ جب اس بنیادی فرق کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے تو اختلاف کو دین دشمنی سمجھ لیا جاتا ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں مذہب کا حسن مجروح ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

ان کا اسلوب فتوٰی دینے والا نہیں بلکہ تعلیمی ہے۔ وہ حکم صادر نہیں کرتے بلکہ اصول واضح کرتے ہیں۔ وہ قاری کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ دلیل سنے، اس پر غور کرے اور خود نتیجہ اخذ کرے۔ شاید اسی لیے ان کی بات ہر ایک کو فوراً پسند نہیں آتی، مگر جو سنجیدگی سے سنتا ہے، وہ سوچے بغیر نہیں رہتا—اور یہی کسی مفکر کی اصل کامیابی ہوتی ہے۔

معاشرت، عبادات، عورت کے حقوق، معیشت اور سیاست جیسے حساس موضوعات پر بھی یوسف سیجا کا انداز نہ سخت ہے اور نہ جذباتی، بلکہ متوازن اور حقیقت پسندانہ ہے۔ وہ ہر مسئلے کو ایمان اور کفر کی آخری لکیر

نہیں بناتے، بلکہ یہ واضح کرتے ہیں کہ قرآن انسان کو ایسی زندگی کی طرف بلاتا ہے جو ممکن بھی ہو اور بامقصد بھی۔ ان کے نزدیک دین انسان کو زندگی سے کاٹنے کے لیے نہیں، بلکہ زندگی کو سنوارنے کے لیے آیا ہے۔

سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ یوسف سیجا اختلاف کے باوجود شائستگی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں بلند آواز اور سخت زبان کو غیرتِ ایمانی سمجھ لیا گیا ہو، وہ عملی طور پر یہ دکھاتے ہیں کہ مضبوط دلیل کے لیے شور ضروری نہیں ہوتا۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ علم کا اصل وقار لہجے میں نہیں بلکہ استدلال میں ہوتا ہے۔

آخر میں، یوسف سیجا ہمیں اپنا پیروکار نہیں بناتے۔ وہ ہمیں اپنے پیچھے کھڑا نہیں کرتے بلکہ قرآن کے سامنے کھڑا کرتے ہیں۔ وہ واضح پیغام دیتے ہیں کہ میں درست بھی ہو سکتا ہوں اور غلط بھی اصل معیار قرآن ہے، دلیل ہے اور سچ ہے۔

اگر کوئی فکر نوجوان کو مذہب کے قریب لائے بغیر اس کی عقل چھینے،
اگر کوئی عالم سوال سن کر ناراض نہ ہو،
اور اگر کوئی مذہبی گفتگو خوف کے بجائے امید پیدا کرے،تو ایسی فکر کی اہمیت خود بخود قائم ہو جاتی ہے۔

اسی لیے علامہ یوسف سیجا سے اتفاق کرنا بھی ایک فکری حق ہے اور اختلاف کرنا بھی۔
مگر سمجھے بغیر رد کر دینا دراصل اپنے ہی سوالوں سے فرار ہے۔وہ ہمیں یہی سکھاتے ہیں کہ:

ایمان سوچ سے نہیں ڈرتا،
سوچ سے مضبوط ہوتا ہے۔

اختتامی کلمات: علامہ یوسف سیجا سوچنے کی دعوت

علامہ یوسف سیجا کو اگر ایک جملے میں سمجھنا ہو تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ **سوچنے کی دعوت** دیتے ہیں، مان لینے کا دباؤ نہیں۔ ان کی اصل پہچان یہ نہیں کہ وہ کیا کہتے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ وہ **کیسے کہتے ہیں** اور **کیوں کہتے ہیں**۔ وہ مذہب

کو ڈر، غصے یا شور کے ساتھ پیش نہیں کرتے، بلکہ عقل، وقار اور قرآن کے ساتھ جوڑ کر سامنے رکھتے ہیں۔

آج بہت سے نوجوان مذہب سے اس لیے دور ہوتے جا رہے ہیں کہ انہیں بتایا جاتا ہے:
سوال نہ کرو، بس مان لو۔
یوسف سیجا اس رویّے سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر قرآن اللہ کی طرف سے ہے تو وہ انسانی عقل سے خوفزدہ نہیں ہو سکتا۔ ان کے نزدیک ایمان وہ چیز نہیں جو سوال سے ٹوٹ جائے، بلکہ وہ شعور ہے جو سوال کے بعد مضبوط ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ نوجوانوں کے شکوک، الجھنوں اور اعتراضات کو دشمنی نہیں سمجھتے بلکہ سیکھنے کا دروازہ مانتے ہیں۔

یوسف سیجا کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ **دین** اور **دین کی انسانی تعبیر** کے فرق کو واضح کرتے ہیں۔ وہ یہ بات سادہ لفظوں میں سمجھاتے ہیں کہ دین خدا کی طرف سے کامل ہے، لیکن دین کو سمجھنے والے انسان ہیں، اور انسان غلطی بھی کر سکتے ہیں۔ یہی فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے ہم اکثر دین کو انسانوں کی آراء کے ساتھ گڈ مڈ کر دیتے ہیں اور پھر اختلاف پر لڑ پڑتے ہیں۔

وہ فتوٰی دینے کے بجائے قرآن کے اصول سامنے رکھتے ہیں۔ وہ قاری یا سامع کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ خود غور کرے، سمجھے اور نتیجہ نکالے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بات ہر کسی کو فوراً قبول نہیں ہوتی، مگر جو سنجیدگی سے سنتا ہے وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور یہی کسی مفکر کی اصل کامیابی ہوتی ہے۔
معاشرت، عبادات، عورت کے حقوق، معیشت، سیاست اور اخلاقیات جیسے
موضوعات پر ان کا انداز سخت یا جذباتی نہیں بلکہ متوازن ہے۔ وہ چیزوں کو ان کی جگہ پر رکھتے ہیں۔ وہ یہ سمجھاتے ہیں کہ ہر بات کو "کفر و ایمان" کی آخری لکیر بنا دینا نہ قرآن کا مزاج ہے اور نہ عقل کا۔ قرآن انسان کو ایک ایسی زندگی کی طرف بلاتا ہے جو ممکن بھی ہو اور خوبصورت بھی۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ یوسف سیجا اختلاف کے باوجود بدتمیزی نہیں کرتے۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں بلند آواز اور سخت زبان کو غیرتِ ایمانی سمجھ لیا گیا ہو، وہ یہ عملی مثال پیش کرتے ہیں کہ وقار کے ساتھ اختلاف کیسے کیا جاتا ہے۔ وہ یہ بتاتے ہیں کہ دلیل کمزور ہو تو غصہ آتا ہے، اور جب دلیل مضبوط ہو تو لہجہ نرم رہتا ہے۔

امام مالک بن انس اور علامہ یوسف سیجا: ایک قرآنی رہنما کا موازنہ

پہلو	امام مالک بن انس (93–179 ہجری)	علامہ یوسف سیجا (جدید دور)
مرکزی مقصد	قرآن و سنت کی روشنی میں لوگوں کے سوالات کا جواب دینا اور فہمِ دین کو عام کرنا	قرآن کی تعلیمات کو موجودہ دور کے چیلنجز کے مطابق زندہ رکھنا اور لوگوں کو خود سوچنے کی ترغیب دینا
فکری اصول	"کل کلام یوخذ منه و یرد" – ہر قول سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور ہر قول کی تنقید کی جا سکتی ہے	علمی اور فکری مباحث میں مختلف مفکرین کے قول سے استنباط کرتے ہیں، مگر ہر بات پر نرم انداز میں روشنی ڈالتے ہیں
رہنمائی کا طریقہ	سوالات کا جواب دیتے، لوگوں کو اپنی رائے کے مطابق ہدایت دیتے	سوال کرنے، سوچنے اور خود تجزیہ کرنے کی آزادی دیتے، اصول پر مبنی رہنمائی فراہم کرتے ہیں
شخصیت کا مقام	خود کو فوقیت نہیں دیتے بلکہ قرآن اور سنت کو اہمیت دیتے	خود کو اہم نہیں سمجھتے، بلکہ قرآن اور اس کی روشنی کو مرکزی حیثیت دیتے
دور کے چیلنجز	فکری اور مذہبی اختلافات، فقہی مسائل، عام لوگوں کی رہنمائی	جدید سائنسی، سماجی اور فلسفی چیلنجز، نوجوان نسل کے لیے قرآن کو قابل فہم اور عملی بنانا
اثر و رسوخ	اسلامی فقہ اور تعلیمات میں مستند، عالم اسلام میں مرجع	جدید دنیا میں مسلمانوں کو علم و فکر کے ذریعے روشنی دینا، فرقہ واریت یا لادینی سوچ کے مقابلے میں قرآنی بصیرت پیش کرنا

آخر میں، یوسف سیجا ہمیں اپنا پیروکار نہیں بناتے۔ وہ ہمیں اپنے پیچھے نہیں، **قرآن کے سامنے کھڑا کرتے ہیں۔** وہ کہتے ہیں:
میں درست ہو سکتا ہوں، میں غلط بھی ہو سکتا ہوں قرآن کو دیکھو، دلیل کو دیکھو، پھر فیصلہ کرو۔

اگر کوئی فکر نوجوان کو مذہب کے قریب لائے بغیر اس کی عقل چھینے، اگر کوئی عالم سوال سن کر ناراض نہ ہو، اور اگر کوئی مذہبی گفتگو انسان کو خوف کے بجائے امید دے تو ایسی فکر کی اہمیت خود بخود قائم ہو جاتی ہے۔

اسی لیے علامہ یوسف سیجا کی فکر سے اتفاق کرنا بھی ایک حق ہے اور اس سے اختلاف کرنا بھی۔ مگر اسے سمجھے بغیر رد کر دینا دراصل اپنے ہی سوالوں سے فرار ہے۔ وہ ہمیں یہی سکھاتے ہیں کہ **ایمان سوچ سے نہیں ڈرتا، سوچ سے مضبوط ہوتا ہے۔**

علامہ یوسف سیجا اور معاصر قرآنی فکر: اہم نکات

قرآنی روشنی اور فکری آزادی

یوسف سیجا کا مقصد لوگوں کو اپنے دماغ سے سوچنے کی دعوت دینا ہے، نہ کہ کسی پیروکار یا مکتبِ فکر کے طور پر ان کے پیچھے چلنا۔

علم و فکر میں شخصی تقدیس نہیں، بلکہ قرآن اور دلیل مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایمان اور عقل کا ہم آہنگی والا تصور

ایمان اور عقل کو ایک دوسرے کے مخالف نہیں، بلکہ عقل ایمان کو سمجھنے اور نکھارنے کا ذریعہ ہے۔

سوال کرنا ایمان کے لیے خطرہ نہیں، بلکہ اس کا حصہ اور تقویت ہے۔

فتویٰ یا حکم دینے کے بجائے تعلیمی روش

قاری یا سامع کو غور و فکر کرنے، سوال کرنے اور خود نتیجہ اخذ کرنے کی آزادی دیتے ہیں۔

ان کا اسلوب نرم، مکالماتی اور تعلیمی ہے، نہ کہ خطیبانہ یا دباؤ والا۔

مذہب اور انسانی تعبیر میں فرق

دین خدا کی طرف سے کامل ہے، لیکن اس کی تعبیر اور اطلاق انسان کی سمجھ سے مشروط ہے۔

یہی نکتہ مذہبی تنازعات کی جڑ کو واضح کرتا ہے اور فکری دیانت کا مظہر ہے۔

معاشرت، سیاست، عورت کے حقوق اور اخلاقیات

مسائل کو محض "حلال و حرام" کے خانوں میں محدود نہیں کرتے، بلکہ تاریخی، سماجی اور قرآنی مقاصد کی روشنی میں سمجھاتے ہیں۔

دین کو خوف یا جرم پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں، بلکہ باوقار اور متوازن زندگی کی رہنمائی کے لیے پیش کرتے ہیں۔

اختلاف اور شائستگی۔

مخالفین کے ساتھ بھی احترام اور علمی وقار کے ساتھ بات کرتے ہیں۔

دلیل مضبوط ہو تو لہجہ نرم اور دلیل کمزور ہو تو بحث کا مطلب سمجھاتے ہیں، نہ کہ تنقید یا غصہ۔

پیروی کی دعوت نہیں، سوچنے کی دعوت

وہ کسی نئے "ازم" یا شخصیت پرستی کی طرف نہیں لے جاتے۔

اصل پیغام: قرآن کو سمجھو، عقل استعمال کرو، خود فیصلہ کرو۔ اختلاف کرنا بھی فکری حق ہے، اتفاق کرنا بھی۔

نوجوانوں کے لیے امید

مذہب کو خوف یا جبر کے بجائے فہم، اختیار اور بصیرت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

نوجوانوں کے سوالات کو دشمنی یا نقصان نہیں سمجھتے بلکہ فکری ارتقا کا حصہ سمجھتے ہیں۔

نتیجہ:

علامہ یوسف سیجا کی قرآنی فکر نوجوان اور معاصر دنیا کے لیے ایک زندہ اور متوازن رہنما ہے۔ ان کا پیغام واضح ہے:

"ایمان سوال سے نہیں ٹوٹتا، بلکہ سوچ سے مضبوط ہوتا ہے۔"